قیصر الجعفری
رنگِ حنا
Meer Zaheer Abass Rustmani

مولسری کا پھول

○

رات کے بوجھل سناٹے میں کھلتے ہی مرجھانا تھا
تھوڑی دیر مہک مہکا کر مٹی میں مل جانا تھا

خاکِ چمن تھی انکی قسمت کوئے بتاں کی رات نہ تھی
ماہ وشوں کی زلفیں چومیں یہ ان کی اوقات نہ تھی

کوئی دامن ہاتھ نہ آیا، کوئی پلّو چھو نہ سکے
گجروں میں گوندھے نہ گئے، ریشم سے گیسو چھو نہ سکے

قید رہیں ان کی خوشبوئیں خود اپنی دیواروں میں
ان کی رنگت، انکے رس کے دام نہ تھے بازاروں میں

شاخ سے چھوٹے شاخ سے ٹوٹے خاک میں ملکر خاک ہوئے
پل دو پل میں جیون بھر کے سارے قصے پاک ہوئے

○

ناقدری کی ٹھوکر کھاکر یہ بھی راہ کی دھول نہ ہو
سوچ رہا ہوں میرا فن بھی مولسری کا پھول نہ ہو

○

(قیصر)

سرورق	پران مہرہ
کتابت	نورالدین آزاد
پروڈکشن	انصار حسین فاروقی
	قریش احمد کوثر
	انتظار نعیم اور
	ابراہیم نذیر۔
اشاعتِ اوّل	ایک ہزار
سالِ طباعت	۶۴ء
قیمت	تین روپے
طباعت	یونیورسل لیتھو پریس
	۲۳، نوروجی اسٹریٹ۔
	بمبئی ۲
ٹائٹل	ادبی پرنٹنگ پریس
	شیفرڈ روڈ۔
	بمبئی ۸

ناشر

قیصر مظہر حسین ایڈیٹر "عہدِ حیات"

قیصر الجعفری

رنگِ حنا

دورِ حیات پبلیکیشنز بمبئی نمبر ۳

پرنٹر پبلشر تیمر مظہر حسین نے یونیورسل لیتھو پریس ۲۳ فوروجی اسٹریٹ بمبئی ۳ سے چھپوا کر دور حیات
پبلیکیشنز بمبئی ۸ سے شائع کیا۔

ظفر کے نام

جو بد نصیب بھائی کی "رنگِ حنا" دیکھنے سے پہلے ہی ریل
کے حادثے میں لہولہان ہو کر اس دُنیا سے چلا گیا؛

○

مرنے پر بھی لَو دیتی تھی دیوانے کے دل کی آگ
پتھرائی تھیں آنکھیں لیکن پھول سا چہرہ زرد نہ تھا

قیصر الجعفری

ملنے کے پتے

- تاج آفس ـــــــ محمد علی روڈ، بمبئی نمبر ۳
- صبح ایشیاء ـــــــ پائپ روڈ، کرلا: بمبئی نمبر ۲۴
- مکتبہ آہنگ ـــــــ مانک پور، پرتاپ گڈھ، اودھ
- دورِ حیات پبلیکیشنز ـــ پرنس بلڈنگ ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی ۳

اور غزلیں

پیش لفظ

سید شہاب الدین دسنوی

"رنگِ حنا" مکتبہ دورِ حیات کی پہلی پیش کش ہے۔

ہندوستان میں اُردو کتابوں کی نشر و اشاعت کے کام میں "اردو دوستی" کے بلند دعووں کے باوجود جو دقتیں پیش آرہی ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے ایک نئے مکتبے کا قیام کچھ بے ہنگام سی چیز معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے اس اقدام کی پشت پر کچھ سوچے سمجھے مقاصد ہیں۔ ایک طرف اگر شعوری طور پر یہ اُردو کی بقاء اور ترقی کے لئے جہدِ مسلسل کی طرف اِشارہ کرتا ہے تو غیر شعوری طور پر یہ ناسازگار حالات سے مقابلہ کرنے کا ایک خاموش اعلان بھی ہے

جب کسی مقصد کو یہ دونوں چیزیں حاصل ہو جاتیں تو مایوسیوں اور ناکامیوں کے بادل چھٹنے لگتے ہیں اور اُمید کا اُجالا جھانکنے لگتا ہے۔

یہ شکایت عام ہے کہ اُردو کتابوں کے خریدار بہت کم ہو گئے ہیں۔ افسانوں کے "اچھے اچھے" مجموعے تک خریدار کی طلب میں دم توڑ رہے ہیں، پھر ایک شعری مجموعے کی اشاعت جو نسبتاً ذرا سنجیدہ ہی موضوع ہے کیونکر دانشمندانہ مانی جاسکتی ہے۔ اس کا جواب آپ کو خود "رنگِ حنا" کے صفحات میں مل جائے گا۔ ہم اپنی طرف سے اتنا ہی کہنا چاہتے ہیں کہ ہر زمانے کو اچھے رسالے اور اچھی کتاب کی ضرورت ہوتی ہے جن کی تلاش میں خود خریدار سرگرداں رہتے ہیں اور "رنگِ حنا" اس معیار پر پوری اُترتی ہے۔

سیّد شہاب الدّین دسنوی

سکریٹری۔ دورِ حیات پبلیکیشنز

۲۶ر جنوری سنہ ۶۴ء کا دن تھا شام کو مجھے ایک جلسے میں جانا تھا۔ گرانٹ روڈ کے ریلوے اسٹیشن پر جب میں نے ٹکٹ خریدا تو دس پیسے کے ٹکٹ کے ساتھ ایک بیاض بھی ہاتھ میں آگئی۔ یہ قیصر الجعفری کی نظمیں تھیں جو ویسٹرن ریلوے میں کلرک ہیں۔ ریل کے ٹکٹ نے صرف ایک اسٹیشن تک کام دیا، لیکن قیصر کی نظمیں زندگی میں بہت دور تک ساتھ دیں گی۔ اب تک یہ میرے ہاتھوں میں تھیں اب سیکڑوں ہاتھوں تک پہونچ گئی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اسی طرح دلوں کے اندر اتر جائیں گی۔

اُردو شاعری کے لئے یہ عہد کچھ بہت سازگار نہیں ہے. فلمی گیتوں کی وجہ سے اُردو شاعری کی مقبولیت بہت بڑھ گئی ہے اور اردو تعلیم کی کمی کی وجہ سے اُردو شعر کا علم کم ہو گیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج وہ نظمیں اور غزلیں زیادہ مقبول ہیں، جن پر محبوب کا جسم حاوی ہے، جن میں محبوب کے لئے احترام کی کمی ہے اور واسوخت کا انداز زیادہ ہے۔

اس سے گریز کر کے سنجیدہ شاعروں کا ایک گروہ جو زیادہ تر نئی نسل سے تعلق رکھتا ہے. غمِ ذات میں مبتلا ہو گیا ہے۔ یوں تو غمِ ذات کے بغیر غمِ کائنات کا احساس کسی شاعر کے لئے ممکن نہیں ہے، لیکن غمِ کائنات سے فرار کر کے غم ذات کے قلعے میں اسیر ہو جانا شاعری کے لئے نیک فال نہیں ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ قیصر الجعفری کی شاعری اس تاریک حلقے کی گرفت سے باہر ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس میں زندگی کے مسائل سے دست و گریباں ہونے کی طاقت ہے اور صلاحیت ہے۔ ان میں غمِ ذات بھی ہے اور غمِ کائنات بھی، جو دونوں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے ہوئے ہیں۔

قیصر نے وہی راہ اختیار کی ہے جس پر اُردو شاعری کا کارواں تیس سال سے سفر کر رہا ہے۔ ان کی لفظی تصویریں اگر ایک طرف کلاسیکی روایات کے مطابق ہیں تو دوسری طرف جدید حقیقت نگاری کے معیار پر بھی پُوری اُترتی ہیں۔ یہاں نہ تو جذبات کی وہ افراط ہے کہ لفظوں سے شیرہ ٹپک رہا ہے اور نہ فکر کی وہ زیادتی کہ شعر اور مصرعے خشک چٹانوں میں تبدیل ہو جاتیں۔ ان نظموں اور غزلوں میں فکر اور جذبے کا امتزاج ہے اور یہ امتزاج

شاعر کے مستقبل کی ضمانت ہے

اس مجموعے سے جس کا نام "رنگِ حنا" ہے، قیصر الجعفری اپنا شاعرانہ سفر شروع کر رہے ہیں۔ زندگی اور فن کے راستے ان کا استقبال کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مبارک ہیں وہ قدم جو یقین و اعتماد کے ساتھ اُٹھ رہے ہیں۔

بمبئی۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء

سردار جعفری

○

سرشکِ خونِ تمنّا متاعِ دیدۂ تر
ترے لئے ہے نگارِ حیات! رنج نہ کر
کبھی تو رنگِ حنا کے نصیبؔ جاگیں گے
کبھی تو پھول کھلیں گے تری ہتھیلی پر

غزل

نہ بجتے ہوئے گھنگھرو تھے، اُڑتی ہوئی تانیں تھیں
پہلے انہیں گلیوں میں نغموں کی دُکانیں تھیں

یوں بیٹھ رہیں دل میں، شوریدہ تمنّائیں
گویا کسی جنگل میں پتوں کی اُڑانیں تھیں

یارب مرے ہاتھوں میں تیشہ بھی دیا ہوتا
ہر منزلِ ہستی میں جب اتنی چٹانیں تھیں

وہ لمحۂ لرزاں بھی دیکھا ہے سرِ محفل
اک شعلہ کی مٹھّی میں پروانوں کی جانیں تھیں

ہم مرحلۂ غم میں تنہا تھے کہاں یارو
قاتل تھے ہتھیلیں تھیں، تیغیں تھیں سنانیں تھیں

اک حرفِ محبّت یوں پھیلا کہ گنہ ٹھہرا
افسانے ہمارے تھے، دُنیا کی زبانیں تھیں

غزل

بے یار لے کے موسم دیوانہ گر نہ آؤ
اے بدلیو! وہیں کہیں برسو اِدھر نہ آؤ

یہ کوئی بات ہے کہ ملیں تو ہمیں ملیں
اپنے نگر بلاؤ، ہمارے نگر نہ آؤ

یہ بُعد بھی نگاہِ محبّت پہ بار ہے
اتنے قریب آؤ کہ تم بھی نظر نہ آؤ

گذرے ہوئے دِنوں کی تمنّا نہیں ہو تم
اِکبار ہو کے جاؤ تو پھر لوٹ کر نہ آؤ!

ان کی نظر کو ضد ہے کہ اے رہروانِ شوق!
بھٹکو تمام عمر کبھی راہ پر نہ آؤ

کانٹوں کے جنگلوں سے گئی ہے ہماری راہ
دامن کی فکر ہو تو ہماری ڈگر نہ آؤ

اجنبی لمحے

ہوا کے دوش پر اُڑتے ہوئے یہ اجنبی لمحے
کہیں ایسا نہ ہو پرچھائیاں دے کر گزر جائیں
ہمیں ڈستی ہوئی تنہائیاں دے کر گزر جائیں

○

ڈھلک جاتا ہے اِک اِک پل پہ سر سے ریشمی آنچل
کلائی میں سنہری چوڑیاں کھنکائی جاتی ہیں
چٹک اٹھتی ہوں جیسے نرم کلیاں شاخساروں پر
حنائی انگلیاں اِس ناز سے چٹخائی جاتی ہیں

نشہ سا بھر دیا آنکھوں میں شرمِ اجنبیّت نے
اَدائیں اور زیادہ خُوبصورت ہوتی جاتی ہیں
تعارف، بے تعارف ہو چکا آؤ ہنسیں، بولیں
کہ اب خاموشیاں بڑھ کر قیامت ہوتی جاتی ہیں

○

ملاقاتوں کے دامن میں، تبسّم بھی ہے آنسو بھی
قرارِ جاں میسّر ہو کہ زخمِ دل ملے ہم کو
اُڑے جاتے ہیں پَر تولے ہُوئے یہ اجنبی لمحے
خُدا معلوم کس عالم میں مُستقبل ملے ہم کو

○

مُجھے تم اجنبی کہہ لو، تمہیں میں اجنبی کہہ لوں
مگر اپنائیّت کے تانے بانے بُن رہا ہوں میں
مری خاموش نظروں کے تقاضے تم پہ واضح ہیں
تمہارے مُرتعشِ ہونٹوں کے نغمے سُن رہا ہوں میں

تمنّا کے یہ لمحے، جن میں گیرائی ہے صدیوں کی
ہماری رُوح کی خلوت سرا سے ہو کے آتے ہیں
زباں کھولو، کہو، میں اِن حسین لمحوں سے کیا کہدُوں؟
یہ لمحے پُوچھتے ہیں کیا ابھی تک ہم پرائے ہیں؟

ہوا کے دوش پر اُڑتے ہُوئے یہ اجنبی لمحے

غزل

کس کی باہنوں میں جھولو گی، کس کے مَن کا دھیر بنو گی
جانے کون ہے وہ شہزادہ تم جس کی جاگیر بنو گی

آنکھوں میں پنجاب کا جادو زلفوں میں گجرات کی رات
جانے کس اخترؔ کی سلمٰی، کس رانجھا کی ہیر بنو گی

توڑ رہے ہیں اپنے تیشے، کہساروں میں سو فرہاد
جانے تم کس شہرِ طرب میں موجِ جوئے شیر بنو گی

کتنی آساں ہو جائے گی، اُس پر راہِ جہدِ حیات
تم جس راہی کے قدموں میں پھولوں کی زنجیر بنو گی

دیکھ رہی ہیں میری آنکھیں برسوں سے کچھ نازک خواب
بولو! تم ان بھولے بسرے خوابوں کی تعبیر بنو گی؟

شہرِ غزالاں

یہ نقرئی فضا، یہ قمقموں کی جگمگاہٹیں
یہ سرد رات، یہ ہوا کی نرم سرسراہٹیں
یہ کاروانِ رنگ و نور کی حسین آہٹیں
بکھر گئی ہیں لالہ گوں لبوں کی مسکراہٹیں

مچل رہا ہے خوشبوؤں کا میکدہ نگاہ میں
ٹھہر گیا ہے چاندنی کا آبشار راہ میں

قدم قدم یہاں نظر کی زد پہ ہیں جوانیاں
مچل رہی ہیں پھول سے لبوں پہ سو کہانیاں
سُنا رہا ہے آنکھ کا غرور لَن ترانیاں
لُٹا رہا ہے ساریوں کا رنگ کہکشانیاں

نظر سے جب نظر ملی سمٹ گئیں جھجک گئیں
حسین ٹہنیاں خود اپنے بوجھ سے لچک گئیں

○

کُھلے کُھلے سے گیسوؤں میں ناگنوں کی لہر ہے
دُھلے دُھلے سے عارضوں میں بجلیوں کا قہر ہے
جُھکی جُھکی سی انکھڑیوں کی پیالیوں میں زہر ہے
یہ گل رُخوں کی سرزمیں ہے آہوؤں کا شہر ہے

سُرود و ساز و رقص کا رواج عام ہے یہاں
گُذر چکی ہے نصف رات اور شام ہے یہاں

روش روش بچھا ہوا ہے زرکشی کا جال سا
عروج کے حسین منظروں پہ ہے زوال سا
قدم قدم شکستِ سازِ دل کا احتمال سا
گزر رہا ہے بار بار ذہن میں خیال سا

غرورِ مال و زر کو اک مذاق ہاتھ آگیا
یہاں کہاں میں اپنی مفلسی کے ساتھ آگیا

غزل

عہدِ جنوں میں ہم بھی برسوں جاگے ہیں اور روئے ہیں
کتنی راتوں کے اندھیارے اِن آنکھوں میں کھوئے ہیں

یہ ہنسنا ہے جی بہلاوا، ہم بھی غم میں کھوئے ہیں
چُپکے چُپکے درد اُٹھا ہے، تنہا تنہا روئے ہیں

اِس نگری میں اپنا دامن کب تہمت سے پاک رہا
اتنے دھبے اور لگے ہیں جتنے دھبے دھوئے ہیں

آخرِ شب محفل میں پُہنچے، پینے سے محروم رہے
ٹوٹے جاموں کی تلچھٹ سے سُوکھے ہونٹ بھگوئے ہیں

آج مِلے برسوں میں ہم تم سارا ماضی جاگ اُٹھا
دل میں جتنے گھاؤ بھرے تھے پھُوٹ پھُوٹ کے روئے ہیں

کس کے آگے دُکھڑا رونے جائیں پاؤں کے چھالوں کا
قیصر اپنی راہ میں ہم نے خُود ہی کانٹے بوئے ہیں

شعلۂ حنا

یہ رات، مشعلِ ارماں جلانے آئی ہے
مگر نظر میں اندھیرا سا چھا رہا ہے کیوں؟
وہ غم کدہ جسے ٹھکرا دیا محبّت نے
بھلا رہی ہوں مگر یاد آ رہا ہے کیوں؟

یہ کامیاب ارادے، یہ مضمحل لمحے!
یہ آج زیست میں آخر تضاد کیسا ہے؟
ہجومِ کیف میں بھی روح بیقرار ہے کیوں؟
یہ اضطرابِ دلِ نامراد کیسا ہے؟

قریب و دُور مُسلّط ہے خامشی لیکن
فضاؤں میں کسی طُوفاں کا شور برپا ہے
یہ رات ہے کہ قیامت، یہ تیرگی ہے کہ موت
چراغ جل تو گئے ہیں مگر اندھیرا ہے

غمِ حیات کی پرچھائیوں سے ڈرنا کیا!
میں زندگی کے نئے خواب بن کے آئی ہُوئی
اب اِس دیار میں واپس بھی ہو نہیں سکتی
کہ اپنی پُشت پہ دیوار چُن کے آئی ہوں

لبوں پہ موجِ تبسّم ہے، دل میں گردِ ملال
میں خُوش تو ہُوں مگر آنکھوں سے اشک بہتے ہیں
مِری اُداس جوانی نے مُجھ سے پُوچھا ہے
سُہاگ رات اِسی بے بسی کو کہتے ہیں؟

نہ باپ بھائی کے ہونٹوں پہ آئی کوئی دُعا
نہ ماں نے پیار سے رُخصت کیا گلے مِل کے
ہتھیلیوں میں ہے مہندی نہ مانگ میں افشاں
مچل کے رہ گئے سینے میں ولولے دل کے

رہِ حیات کے ساتھی ترا سہارا ہے
مری وفا، مری جراٴت کی آبرو رکھنا
ترے لئے میں زمانے کو چھوڑ بیٹھی ہوں
مرے غرورِ محبّت کی آبرو رکھنا

غزل

کتنے پتھر ہیں کہ کھائے ہیں سرِ راہِ جنوں
ہم نے سرِ حلقۂ آشفتہ سراں ہونے تک

جانے یہ چاکِ گریباں بھی بچیں یا نہ بچیں
التفاتِ نگہِ بخیہ گراں ہونے تک

اُف وہ ہنگامے جو اُٹھے ہیں سرِ کوچۂ ناز
بام پر آ کے تمہارے نگراں ہونے تک

جانے اِن شمعوں پہ اِن پھولوں پہ کیا کیا گذرے
زینتِ شبکدۂ سیمبراں ہونے تک

کتنے معماروں کا خونِ رگِ جاں کام آیا
تودۂ خاک کے دیوارِ گراں ہونے تک

کتنے آئینے ہمیں توڑنے ہوں گے قیصرؔ
آبروئے رخِ صاحب نظراں ہونے تک

سادگی

میرے ماضی کا کوئی زخم مرے پاس نہیں
جس سے جو چیز ملی تھی اُسے پھیر آیا ہوں
تیری زُلفوں کے ستارے، تری آغوش کے پھُول
جانے کن راہگذاروں میں بکھیر آیا ہوں
ہو گئی ہو گی بلند اور بلند اور بلند
میں ترے گرد جو دیوار سی گھیر آیا ہوں

تُو مری راہ سے گذری تھی ستارے لے کر
میرے احساس پہ چھائے ہوئے سائے نہ گئے
تیری آنکھوں سے تو برسی تھی مئے ہوش رُبا
خُشک ہونٹوں سے یہ پیمانے لگائے نہ گئے
تیری پھیلی ہوئی باہنوں نے پکارا لیکن
دو قدم مجھ سے تری سمت اُٹھائے نہ گئے

میں نے الفاظ کے پردے میں محبّت ڈھونڈی
اِرتعاشِ لبِ گُل گوُں کی صدا سُن نہ سکا
میں نہ سمجھا تِری خاموش نظر کا مفہوم
آنکھوں آنکھوں میں وہ اقرارِ وفا سُن نہ سکا
میں نے اندازِ تمنّا کو تغافل جانا
تیری بھیگی ہوئی پلکوں کا گِلا سُن نہ سکا

آج جب زخمِ تمنّا کا نشاں تک نہ رہا
تو مجھے زخمِ تمنّا کی دوا یاد آئی

خاک اُڑنے لگی جب روح کے ویرانے میں
تیری بکھری ہوئی زُلفوں کی گھٹا یاد آئی

آج جب سُوکھ گئے پھُول ہی ارمانوں کے
تیرے مہکے ہوئے آنچل کی ہوا یاد آئی

غزل

پو پھوٹ چکی، اذنِ سفر سب کے لئے ہے
اِک منزلِ تاباں کی خبر سب کے لئے ہے

یہ مے کدۂ فکر و نظر سب کے لئے ہے
آؤ کہ مرا خونِ جگر سب کے لئے ہے

اے شمع! کسی بزم سے منسوب نہیں ہم
جاں سوزیِ اربابِ ہنر سب کے لئے ہے

اِک شاخ یہ جو پھول کِھلائے وہ ضیا کیا؟
ہاں فصلِ بہار آئے اگر سب کے لئے ہے

دیکھا ہے کہ کچھ لوگ ہوئے لالہ بداماں
سُنتے تھے کہ اِنعامِ سحر سب کے لئے ہے

قیصرؔ مری غزلیں ہیں مرے غم کی ودیعت
یہ دولتِ اَفکار مگر سب کے لئے ہے

کھنڈر

میں جب بھی تیرے گھر کے پاس سے ہو کر گزرتا ہوں
مجھے کھوئی ہوئی رعنائیاں آواز دیتی ہیں
تری یادیں، تری پرچھائیاں آواز دیتی ہیں

یہ قفلِ زنگ آلودہ، یہ گھر کے بند دروازے
ترے ترکِ وطن کا دُکھ بھرا افسانہ کہتے ہیں
منڈیروں پر یہ لہراتے ہوئے پُرہول سنّاٹے
شکستِ خواب کی رُودادِ غم دہراتے رہتے ہیں
یہاں ہر شام محرابوں میں اُڑتی ہیں ابابیلیں
یہاں پچھلے پہر شبنم کے آنسو روز بہتے ہیں

شبیں آ کر گذر جاتی ہیں، شمعیں تک نہیں جلتیں
سحر آ کر چلی جاتی ہے، آرائش نہیں ہوتی
پسِ پردہ کسی آواز کے گھنگھرو نہیں بجتے
پسِ چلمن کسی رخسار کی تابش نہیں ہوتی
پسِ دیوار لہراتے نہیں اب ریشمی آنچل
پسِ روزن نشاط و کیف کی بارش نہیں ہوتی

وہ تلخی شدّتِ جذبات نے بھر دی ہے رگ رگ میں
کہ تیرے غم میں رویا ہوں تو خود پر مسکرایا ہوں
جو دُنیا کھو گئی میں ہوں اُسی دنیا میں آوارہ
جو شمعیں نذرِ طوفاں ہو گئیں میں اُنکا سایا ہوں
نہ جانے اجنبی بستی میں تیرا حال کیا ہو گا
میں اپنے شہر کی گلیوں میں ہوں لیکن پرایا ہوں

دیارِ غیر میں اب قید ہیں وہ ریشمی جلوے

جنھوں نے میری راہوں میں مہ و انجم بکھیرے ہیں

میں سمجھا تھا مری راتوں میں چمکیں گے ترے عارض

میں سمجھا تھا، سہانی چوڑیوں کے گیت میرے ہیں

مگر تقسیم نے رُوحوں کو بھی تقسیم کر ڈالا

یہاں بھی گھُپ اندھیرے ہیں وہاں بھی گھُپ اندھیرے ہیں

میں جب بھی تیرے گھر کے پاس سے ہو کر گزرتا ہوں

مجھے کھوئی ہوئی رعنائیاں آواز دیتی ہیں

تری یادیں، تری پرچھائیاں آواز دیتی ہیں

غزل

دل پر دھر دو ہاتھ، جو تم کو غم کی آگ بجھانی ہو
ورنہ یوں بھڑکاؤ ہمیں جل بجھنے میں آسانی ہو

پیاسی دھرتی ہانپ رہی ہے دو بوندوں سے حاصل کیا
اپنے بادل لے جاؤ جو شبنم ہی برسانی ہو

ڈھونڈھ رہی ہو جنسِ محبت دُنیا کے بازاروں میں
اے میری مُفلس اُمیدو! تُم بھی کیا دیوانی ہو

بابِ بہاراں کھُلتے کھُلتے، یہ موسم بھی آنا تھا
گُنجِ قفس میں ہنگامہ ہو، شاخوں پر ویرانی ہو

اُس خانہ برباد کا عالم، شہر میں کوئی کیا جانے
جس نے اپنے گھر میں رہ کر خاکِ بیاباں چھانی ہو

درد کی لذت بڑھتی جائے، جیسے جیسے عُمر ڈھلے
دِل میں اُتنے نشتر توڑے جتنی یاد پُرانی ہو

صلیب

مٹی مٹی سی امیدیں، بجھے بجھے سے خیال
وہ گل فشانیِ نازو ادا نہیں ملتی
ترے پیام میں اب دلبری نہیں ہوتی
ترے خطوط میں بوئے حنا نہیں ملتی

کبھی یہ ذکر کہ بارش میں گھر ٹپکتا ہے
تمام رات مجھے جاگتے گزرتی ہے
فضا میں جیسے کوئی روئے سسکیاں لیکر
ہوا منڈیر پہ یوں سائیں سائیں کرتی ہے

کبھی یہ ذِکر کہ موسم بدلنے والا ہے
ہوائیں برف کے گالے اُڑاتی آئیں گی
یہ سردیوں کے مہینے یہ نامُراد شبیں
ٹھٹھر ٹھٹھر کے کہاں تک گذاری جائیں گی

کبھی یہ ذِکر کہ شاہد کی فیس باقی ہے
کئی دِنوں سے وہ اسکول بھی نہیں جاتا
تمہارا خرچ مہینوں ہوئے، نہیں آیا
اب ایسی بات کوئی بھول بھی نہیں جاتا

ترا گِلہ مرے افلاس کا علاج نہیں
تری تڑپ سے مرا زخم اور چھِلتا ہے
ستم ہے وقت نے بیکار بھی نہیں رکھا
کہ ایک ماہ میں دس روز کام مِلتا ہے

غموں کی دھوپ میں کمھلا گیا جمال ترا
وفورِ شرم سے رُخ پر مرے پسینہ ہے
میں ہر مہینے تجھے خرچ کِس طرح بھیجوں
یہاں تو تین مہینوں کا اِک مہینہ ہے

کبھی جو ہاتھ میں آتا ہے محنتوں کا صِلہ
تو اِک کرن مری راہوں میں پھیل جاتی ہے
مری حیات ہے اُن لوپ لائنوں کی طرح
کبھی کبھار، جہاں کوئی ریل آتی ہے

نظامِ زر میں غریبوں کو اختیار نہیں
کہ جسم و جاں کی تباہی پہ آہ بھی کر لیں
میں وہ صلیب ہوں جس پر تری تمنّائیں
جو کوئی راہ نہ پائیں تو خودکشی کر لیں

غزل

جان دینے کو مرے بعد کوئی دِل نہ اُٹھا
پھر یہ ہنگامہ سرِ کوچۂ قاتل نہ اُٹھا

لے ترا ظرف یہی ہے تو چلا جاتا ہوں
میرے آنے سے بساطِ شبِ محفل نہ اُٹھا

لیلیِٰ شوق ! ابھی اور بھی لوگ آئیں گے
کیا ہوا مجھ سے اگر پردۂ محمل نہ اُٹھا

ہم جو ڈوبے ہیں تو رونا تو بہت دُور رہا
کوئی ہنسنے کے لئے بھی لبِ ساحل نہ اُٹھا

جانِ من ! گردشِ دوراں کو گذر جانے دے
کچھ دِلوں اور محبّت کے مسائل نہ اُٹھا

تبصرہ دردِ محبّت پہ ہو کیوں کر قیصر
اُن کی محفل میں کبھی مسئلہ دِل نہ اُٹھا

پیرہن

ہر برس یہ گُل بُوٹے خاک سے اُبھرتے ہیں

آب و گِل کے دامن میں نقشِ نو سنورتے ہیں

رنگ و بُو کے آئینے ٹوٹ کر نکھرتے ہیں

زنگ لگ نہیں سکتا وقت کی سلاخوں پر

پھول مُسکراتے ہیں بار بار شاخوں پر

قافلے بہاروں کے ہر برس گذرتے ہیں

جب خزاں میں ہر پتہ آب و رنگ تجتا ہے
دفعتاً گھٹاؤں میں جل ترنگ بجتا ہے
بجلیوں کے جھومر سے آسمان سجتا ہے
کونپلوں سے دھرتی کی خوشبوئیں چھلکتی ہیں
ڈنٹھلوں میں کلیوں کی چھاتیاں دھڑکتی ہیں
جب فضا میں پانی کا دیوتا گرجتا ہے

ایک شمع بجھتی ہے، ایک شمع جلتی ہے
ارتقا کے سانچے میں کائنات ڈھلتی ہے
رات کے دریچوں سے روشنی اُبلتی ہے
چاند ڈوب جاتا ہے، چاندنی نہیں مرتی
آدمی کے مرنے سے زندگی نہیں مرتی
موت کے پسِ پردہ پیرہن بدلتی ہے

غزل

نہ سوالِ جام، نہ ذکرِ مے، اُسی بانکپن سے چلے گئے
ترا ظرف دیکھ کے تشنہ لب، تری انجمن سے چلے گئے

کبھی تُو نے سوچا بھی صبحِ نو! کہ تمام رات گذار کے
جنہیں ڈس گئی تری روشنی وہ کہاں وطن سے چلے گئے

کبھی یاد آئیں گے باغباں! وہ پیمبرانِ بہار بھی
جنہیں پھُول راس نہ آسکے، جو ترے چمن سے چلے گئے

مرے دل کے ساتھ ہی وقف ہے تری چشمِ ناز کی بے رُخی
کہ وہ دلبری کے طریق ہی، تری انجمن سے چلے گئے

مجھے دُھن کہ کاکُلِ زندگی جو بکھر گئی ہے سنوار دوں
تمہیں غم کہ عشق کے تذکرے، مرے شعر و فن سے چلے گئے

ترے گیسوؤں سے عزیز تھیں جنہیں کائنات کی اُلجھنیں
ترا غم سمیٹ کے رُوح میں، تری انجمن سے چلے گئے

مری بیخودی نے گنوا دئیے، ترے التفات کے مرحلے
مرے ہاتھ آئے تھے دو جہاں مرے سادہ پن سے چلے گئے

تری زندگی کو سنوار دیں، تری رہگذار میں جا بسیں
وہ بھری بہار کے قافلے جو مرے چمن سے چلے گئے

مرے دل کو تیغِ بے نوا کوئی غم شکست نہ دے سکا
کہ اُلجھ کے سینکڑوں حادثے مرے بانکپن سے چلے گئے

غزل

سب کی پیاس بجھائیں، اب یہ رسمیں عام نہیں
محفل میں اِس پیمانے کا کوئی جام نہیں

جلوے بھی ہیں گھائل گھائل، نظریں بھی مجروح
اب وہ عارض صبح نہیں، وہ گیسو شام نہیں

کتنے رنگیں افسانوں کا بنتی ہیں عنوان
وہ سادہ سی نظریں جن کا کوئی نام نہیں

دیکھا ہے نزدیک سے ہم نے دُنیا کا بازار
مٹّی کی قیمت ہے لیکن دِل کے دام نہیں

ٹوٹ گیا تو پھر جیون میں مِلنا ہے دُشوار
سوچ سمجھ کر ٹھوکر مارو! دِل ہے جام نہیں

پہلے جلتی دھوپ میں قیصر آجاتی تھی نیند
شبنم کی بوچھار ہے لیکن اب آرام نہیں

غزل

شمشیرِ برہنہ کے مقابل سے گزر کے
دیکھیں تو ذرا کوچۂ قاتل سے گزر کے

وہ قافلۂ رنگ ہو یا دورِ بہاراں
آتا ہے چمن میں تری محفل سے گزر کے

جو داغ ہے اِک شمع ہے جو زخم ہے اِک پھول
دیکھو تو کبھی انجمنِ دل سے گزر کے

کھلتے ہیں اندھیروں میں اُجالوں کے دریچے
آتی ہے سحر رات کی منزل سے گزر کے

کچھ اور بھی بیباک ہوئے راہِ جنوں میں
ہم مرحلۂ طوق و سلاسل سے گزر کے

ہاں اے غمِ جاناں! تجھے بھولے نہیں قیصرؔ
آتے ہیں غمِ جاں کے مراحل سے گزر کے

سرِ شام

ڈھل گئی شام تارے نکلنے لگے
پڑ گئیں روئے خورشید پر جھائیاں
دُور تک اک تھکن، ایک افسردگی
تا اُفق کپکپاتی ہیں پرچھائیاں
لہر اُونچی کبھی، لہر نیچی کبھی
آ رہی ہیں سمندر کو انگڑائیاں
نیلی نیلی سی ہے ساحلوں کی فضا
بھیگی بھیگی سی ہیں نرم پُروائیاں
چھُپ گئی شام کی نیلگوں روشنی
خواب گوں ہو گئیں شب کی پہنائیاں

محفلِ مہ وشاں منتظر ہے مگر
مر چکی ہیں مری بزم آرائیاں
میں اِدھر، منزلِ رنگ و نغمہ اُدھر
درمیاں ہیں مری آبلہ پائیاں
کوئی دل کا خلا بھرنے والا نہیں
کون دیکھے غمِ دل کی گہرائیاں
مٹ چکی ہے خیالات کی بُت گری
لُٹ چکی ہیں تصوّر کی رعنائیاں
اِک زمانہ ہُوا ساز ٹوٹے ہوئے
ایک مُدّت ہوئی چُپ ہیں شہنائیاں
رہگُزارِ تمنّا کے ہر موڑ پر
گود پھیلائے بیٹھی ہیں رُسوائیاں
میری راہوں میں حائل ہے دیوارِ غم
میرے قدموں سے لپٹی ہیں پسپائیاں
قسمتِ دامنِ شوق، بے مائیگی
حاصلِ جستجو، راہ پیمائیاں

چھپ گئی شام کی نیلگوں روشنی
خواب گوں ہو گئیں شب کی پہنائیاں
اے دلِ مُضطرب آ کہ اب گھر چلیں
راستہ دیکھتی ہوں گی تنہائیاں

غزل

مایوسی کی برف پڑی تھی لیکن موسم سرد نہ تھا
آج سے پہلے دل میں یارو! اتنا ٹھنڈا درد نہ تھا

تنہائی کی بوجھل راتیں پہلے بھی تو برسی تھیں
زخم نہیں تھے اتنے قاتل، غم اتنا بیدرد نہ تھا

پھرتے ہیں اب رسوا ہوتے، کل تک یہ رفتار نہ تھی
شہر میں تھیں سو کوئے ملامت دل آوارہ گرد نہ تھا

مرنے پر بھی لَو دیتی تھی دیوانے کے دل کی آگ
پتھرائی تھیں آنکھیں لیکن، پھول سا چہرہ زرد نہ تھا

حرفِ تسلّی، موجِ ہوا تھے، موجِ ہوا سے ہوتا کیا
سینے کا پتھر تھا قیصرؔ، غم دامن کی گرد نہ تھا

۲۳ نومبر ۱۹۶۴ء

اولاد

بہار آئیگی، پھُوٹے گی شاخ سے کونپل
شکستِ برگِ خزاں سے یقین ہوتا ہے
جو تُم ہو ساتھ تو محسوس ہو رہا ہے مُجھے
خزاں نصیب چمن بھی حسین ہوتا ہے

ہتھیلیوں سے حِنا تک ابھی نہ چھُوٹی تھی
گلے کے پھُول بھی باسی نہ ہونے پائے تھے
کہ وہ حسین و جواں سال خواب ٹُوٹ گئے
سُہاگ رات جو افشاں میں جگمگائے تھے

زمانہ کو کھ جلی کہہ رہا ہے، کہنے دو
تمہارے ہاتھ میں قسمت کا فیصلہ تو نہیں
تمہارا کام ہے پھولوں کی آرزو کرنا
تمہارے بس میں بہاروں کا قافلہ تو نہیں

نفس نفس پہ یہ احساسِ تیرگی کیسا ؟
پلک پلک میں ستارے پرو رہی ہو کیوں ؟
تمہیں تمام چمن میں نے سونپ رکھا ہے
تم اِک کلی کے لئے جان کھو رہی ہو کیوں ؟

غریب قوم کے یہ ہونہار شہزادے
تم اپنے پیار کی رعنائیاں انہیں دیدو
تم اپنے دل کی محبّت بکھیر دو ان پر
تم اپنی رُوح کی تنہائیاں انہیں دیدو

کہیں کھلے ہوں مگر کتنے پیارے پیارے ہیں   یہ پھُول اپنے نہیں ہیں مگر ہمارے ہیں

غزل

بھیجے ہیں قصرِ شب نے سندیسے سحر کے نام
اک سیلِ رنگ و بُو مرے ہر بام و در کے نام

ترتیب دی ہیں لغزشِ پا کی حکایتیں
منسوب کر رہا ہوں تری رہگذر کے نام

ہیں چاندنی کے شہر مرے انتظار میں
پیغام آ رہے ہیں یہ عزمِ سفر کے نام

ہم کشتگانِ شب کے لہو سے لکھے گئے
کیا کیا حسیں پیام، نگارِ سحر کے نام

کیا کیا حسین لوگ ملے اور بچھڑ گئے
یاد آ رہے ہیں آج ہمیں عمر بھر کے نام

قیصرؔ بھلا دئے گئے پہلی کرن کے ساتھ
گم گشتگانِ تیرگیِ رہگذر کے نام

غزل

ہم اہلِ درد، شرحِ غمِ آرزو کریں
ٹوٹیں زباں کے قفل تو کچھ گفتگو کریں

بے برگ و بار شاخ ہیں صحنِ چمن میں ہم
پوچھو صبا سے، ہم بھی امیدِ نمو کریں؟

اے منزلِ حیات! مرا تجربہ یہ ہے
جو خود کو کھو سکیں وہ تری جستجو کریں

اہلِ چمن منائیں بہاروں کا جشنِ عام
ہم بد نصیب بیٹھ کے دامن رفو کریں

ہم بھی ہیں مے پرست مگر اے غمِ بہار!
کس دل سے اہتمامِ شراب و سبو کریں

رُودادِ حسن و عشق بھی دلچسپ ہے، مگر
جی چاہتا ہے اور کوئی گفتگو کریں

کال

کھیتیاں جل گئیں، دھرتی کا لہو سوکھ گیا
بدلیاں ڈھل گئیں، دہکے ہوئے انگاروں میں
کال کا دیو ہے مُنہ کھولے ہوئے محوِ شکار
گاؤں کی گلیوں میں، کھلیانوں میں، بازاروں میں

پھول جلتے ہیں، گلستاں پہ دھواں چھایا ہے
آج ہر شاخِ نشیمن سے شرر چھنتے ہیں
آج بیواؤں کے نالوں سے فضا ہے بوجھل
آج شادی کے دوپٹوں سے کفن بنتے ہیں

مُنہ اندھیرے نہیں پنگھٹ پہ حسینوں کا ہجوم
ڈوبتے چاند کا جادو کوئی چلتا ہی نہیں
موڑ سُنسان ہیں، سوتی ہوئی گلیاں ہیں خموش
گاگریں سر پہ لئے کوئی نکلتا ہی نہیں

چکّیوں پر وہ مدھر گیت سحر سے پہلے
کون گائے کہ میسّر ہی نہیں دانۂ جو
سرخ آنکھوں سے یہ کتراکے گذرتی ہوئی نیند
رات ڈھلتی ہے مگر آج مہکتی نہیں پو

زہر آلود فضاؤں میں یہ اُڑتے ہوئے گدھ
سانس لیتی ہوئی لاشوں کی یہ لمبی سی قطار
اُف یہ انسان کہ جیتے نہیں مرتے بھی نہیں
ان کی قسمت میں کفن ہے نہ چِتا ہے نہ مزار

گاؤں سے دُور جو پردیس کے گیہوں مہکے
بِھیڑ سی ٹوٹ پڑی شہر پہ کنگالوں کی
زندگی خوار و زبوں پھرتی ہے بازاروں میں
لاش کاندھے پہ اُٹھائے نئے بنگالوں کی

بُھوک کی آگ بھڑک اُٹھی ہے بستی بستی
آدمی سر بگریباں ہے یہ عَالم کیا ہے؟
ایسے شُعلوں سے جو بھر جائے زمیں کا سینہ
"یوجناؤں" کی برستی ہوئی شبنم کیا ہے؟

غزل

بکھرا دیئے صیّاد کی بیدادگری نے
جو پھول کھلاتے تھے نسیمِ سحری نے

اربابِ نشیمن کو مُبارک ہوں بہاریں
بھیجے ہیں سندیسے مری بے بال و پری نے

اب بھی ہیں تہِ تیغ مگر فرق ہے اتنا
ہم سیکھ گئے ہیں، نہ تڑپنے کے قرینے

بن جائیں گے ناسُور جو یونہی کوئی دِن اور
چھیڑا مرے زخموں کو تری چارہ گری نے

ٹوٹیں نہ کہیں شہر و بیاباں کی طنابیں
پھیلائی ہیں باہیں مری آشفتہ سری نے

ہلکی سی خُنک چھاؤں میں نیند آگئی قیصرؔ
کھویا مجھے منزل پہ مری بے خبری نے

اندھے پُجاری

○

یہ کون لوگ سرِ میکدہ پہنچ آئے
چھلک رہا ہے لہو ہی لہو ایاغوں سے
یہ کون لوگ ہیں جو زندگی کے محلوں کو
سجانے آتے ہیں بجھتے ہوئے چراغوں سے
برس رہا ہے اندھیرا جبیں کے داغوں سے

○

یہ کون لوگ ہیں جو آفتاب سے چھُپ کر
پُرانی شمعوں پہ نظریں جمائے پھرتے ہیں
یہ کون لوگ ہیں جو ارتقاء کی منزل ہیں
نئی حیات سے دامن بچائے پھرتے ہیں
روایتوں کے جنازے اُٹھائے پھرتے ہیں

انہیں پسند نہیں شاخِ گُل کی رعنائی
سلوکِ بادِ چمن ناگوار ہے ان کو
بھٹک رہے ہیں یہ ماضی کے ریگ زاروں میں
بہارِ نو کا تصوّر بھی بار ہے ان کو
جو فصل بیت چُکی اس سے پیار ہے ان کو

○

بھرا ہے عہدِ کہن کا غبار آنکھوں میں
انہیں گراں ہے نئی کائنات کا پرتو
یہ مندروں کے پُجاری یہ مسجدوں کے امام
یہ تیرگی کے مُسافر، یہ رات کے رہرو
اُفق کو نوچ رہے ہیں کہ توڑ لیں مہِ نو

○

ہوس کی قید میں ہے آبروئے لالہ و گُل
چمن فروش بنے ہیں چمن کے رکھوالے
ذرا سنبھل کے چلے کاروانِ رنگ و نمو
کہ خار بیٹھے ہیں پھُولوں کی چلمنیں ڈالے
صبا کے بھیس میں پھرتے ہیں لُوٹنے والے

یہ لوگ حلقۂ دامِ خیال کہتے ہیں
فروغِ علم کو، سائنس کی ترقّی کو
یہ کم نگاہ، مداوائے دردِ انسانی
سمجھ رہے ہیں پراچین سنسکرتی کو
صدائیں دیتے ہیں صدیوں کی تیرہ بختی کو

○

زبان و فرقہ و مذہب کے غار میں یہ لوگ
ہوئے ہیں غرق کچھ ایسے، اُبھر نہیں سکتے
اَٹے ہیں گرد میں جب تک دلوں کے آئینے
نئے نقوش میں ہم رنگ بھر نہیں سکتے
نگارِ ہند کے گیسو سنور نہیں سکتے

○

جلیں نہ رُوح میں جبتک محبّتوں کے چراغ
طلسم تیرہ خیالی سے ہم نہ چھُوٹیں گے
وہ لوگ معبدِ انسانیت کی سیر کریں
جو کہہ رہے ہیں کہ دیر و حرم نہ چھُوٹیں گے
جو ضد میں ہیں کہ پُرانے صنم نہ چھُوٹیں گے

غزل

دورِ خزاں، نویدِ صبا دے گیا مجھے
جو غم ملا خوشی کا مزا دے گیا مجھے

اترا نہیں خمار، پلا دی جسے جسے
غم وہ شرابِ ہوش رُبا دے گیا مجھے

یہ اور بات ہے مری آنکھیں نہ کھُل سکیں
ورنہ ہر انقلاب صدا دے گیا مجھے

اے شامِ بیکسی! مری پلکیں سُلگ اُٹھیں
یوں کون جاگنے کی سزا دے گیا مجھے

آیا تھا زندگی میں محبّت کا دور بھی
کیا کیا سُرورِ لغزشِ پا دے گیا مجھے

قیصؔر مری غزل ہے کہ فطرت کی ترجماں
یہ فن پیمبرانہ نوا دے گیا مجھے

غزل

وہی ادا، وہی انداز لے کے آجاؤ
بہارِ جنّتِ آغاز لے کے آجاؤ

سناؤ پیار بھرے گیت پھر نگاہوں سے
نشاطِ نغمۂ بے ساز لے کے آجاؤ

جراحتوں کا نشانہ بناؤ پھر دل کو
تمام کار گہہِ ناز لے کے آجاؤ

تم اپنی زلفِ پریشاں کی نرم چھاؤں میں
شبوں کے مچلے ہوئے راز لے کے آجاؤ

بہت دنوں سے یہاں چوڑیاں نہیں کھنکیں
مدھر مدھر وہی آواز لے کے آجاؤ

نظر نظر میں نشہ ہو، نفس نفس میں کھنک
ہزار شیشہ و صد ساز لے کے آجاؤ

یادِ صبا لاتی تھی خوشبو ابرِ خراماں آیا تھا؟
یاد نہیں، کب دِل کے چمن میں دورِ بہاراں آیا تھا

دیوانے اس شان سے گزرے جبر و سزا کی منزل سے
ایک زمانہ حیراں حیراں تا درِ زنداں آیا تھا

دشت و بیاباں چھانے ہم نے زِنداں دیکھے مقتل بھی
کیا جانے کب کس رستے میں شہرِ نگاراں آیا تھا

خُوب گلے مِل مِل کے روئے، خُوب کریدے دل کے گھاؤ
رات بہت دن بعد خیالِ گیسوئے جاناں آیا تھا

بربادی کے بعد ہمارے رونے والے لاکھوں تھے
پہلے ڈوبی دِل کی کشتی بعد میں طوفاں آیا تھا

بھول نہ جانا قیصر کو اے نغمہ گرانِ صُبحِ بہار!
وہ بھی تمہاری بزم میں لے کر سازِ دل و جاں آیا تھا

فصیلِ شب

دامنِ دل پہ غُبارِ رہِ منزل ہے ابھی
پائے افکار میں دیرینہ سلاسِل ہے ابھی
تیرگی، شعلۂ احساس کا حاصِل ہے ابھی

روشنی قید میں دن کاٹ رہی ہے ابتک
تشنگی دل کا لہو چاٹ رہی ہے ابتک
جو نفس ہے ہدفِ دشنۂ قاتِل ہے ابھی

دِل کے ہر زخم سے رِستا ہے اُمیدوں کا لہو
ریگ زاروں نے کیا خُونِ بہاراں سے وضو
جانے کس راہ میں ہے قافلۂ رنگ و نمو

ایک اِک شاخ شگوفوں سے ہے خالی اب تک
میکدہ ڈھال لیا، مے نہیں ڈھالی اب تک
نہ کہیں رقصِ بہاراں ہے، نہ جشنِ لبِ جُو

روشنی اوڑھ کے ظلمت کا کفن آئی ہے
خون میں ڈوب کے سورج کی کِرن آئی ہے
زخمِ جاں بن کے صبا سُوئے چمن آئی ہے
لب و رخسارِ تمنا پہ نکھار آ نہ سکا
اہلِ دل کو سرِ منزل بھی قرار آ نہ سکا
پھر وہی رہگذرِ دار و رسن آئی ہے

پھر وہی عزمِ سفر لے کے چلے ہیں ہم لوگ

پھر وہی خوابِ سحر لے کے چلے ہیں ہم لوگ

مشعلِ خونِ جگر لے کے چلے ہیں ہم لوگ

ان اندھیروں کا بھرم توڑ کے دم لینا ہے

ہاں فصیلِ شبِ غم توڑ کے دم لینا ہے

تیشۂ فکر و نظر لے کے چلے ہیں ہم لوگ

کچھ دِنوں کشمکشِ جبر و ستم اور سہی

کچھ دِنوں سوزِ دروں، دیدۂ نم اور سہی

گام دو گام سوادِ شبِ غم، اور سہی

صبحِ نو تاب کسی دیوار کے گھیرے میں نہیں!

ہم اندھیرے میں ہیں منزل تو اندھیرے میں نہیں

اتنی دور آئے تو دو چار قدم اور سہی

غزل

احسان مند ہیں نگہہ مے فروش کے
جھگڑے مٹا دیئے غمِ فردا و دوش کے

تھی دیکھنے کی چیز ہماری بہار بھی
ہم آئینہ رہے ہیں کسی لالہ پوش کے

کیوں پی رہا ہے زہر کوئی پوچھتا نہیں
نقّاد سیکڑوں ہیں ترے بادہ نوش کے

ہم پتّھروں کے شہر میں خود آکے بک گئے
غم کیا کریں کسی بُتِ عشوہ فروش کے

ہم نے جنوں کی راہگذر میں جلا لئے
تھے جو چراغ انجمنِ عقل و ہوش کے

قیصر نوائے درد کوئی کیا سنے کہ ہم
تارِ شکستہ ہیں کسی سازِ خموش کے

غزل

غمِ منزل کی لذّت پا گیا ہُوں
بگولہ بن کے اُڑتا پھر رہا ہُوں

میں کس میرِ سفر کا نقشِ پا ہُوں
فتادہ ہوں مگر منزل نُما ہُوں

تُمہاری یاد کتنی دل نشیں ہے
میں اپنے آپ کو بھولا ہُوا ہُوں

تعارُف ہو چُکا ہے بے تعارُف
میں اس کم آشنا سے آشنا ہُوں

مجھے اپنے سوا سب کی خبر ہے
میں خُود کو چھوڑ کر سب سے مِلا ہُوں

مجھے بھی یاد رکھنا اے شبِ غم
میں اپنا دِل جلا کے بُجھ رہا ہُوں

مری شب تابیاں ہیں بار مجھ پر
ستارا ہوں مگر ٹوٹا ہوا ہوں

جسے آنا ہو میرے ساتھ آئے
میں اپنی روشنی میں چل پڑا ہوں

بہت ہیں اپنے غم میں مرنے والے
میں دُنیا بھر کے غم میں جی رہا ہوں

تمہیں دیکھوں تو کیا پہچان پاؤں
تمہارا نام تک بھولا ہوا ہوں

مری سُنتے نہیں اہلِ زمانہ
میں جنگل میں صدائیں دے رہا ہوں

کوئی سمجھا نہ میرا دردِ قیصرؔ
میں اپنی آگ میں تنہا جلا ہوں

پانچ سو برس طویل رات

وہ رات پانچ سو برس جو زہر ڈھالتی رہی
جو سبز سبز وادیوں میں سانپ پالتی رہی
جو ناریل کی چھاؤں میں لہو اُچھالتی رہی

پہاڑ بن کے جو کھڑی تھی روشنی کی راہ میں
وہ رات بہہ گئی سحر کے سیلِ بے پناہ میں!

وہ سیلِ بے پناہ کیا ؟ دِلوں کا عزمِ آہنی
وہ سیلِ بے پناہ کیا ؟ نظر کی شعلہ افگنی
وہ سیلِ بے پناہ کیا ؟ جُنوں کی پاکدامنی

جُنوں کی پاکدامنی سے ہر رَوش چمن بنی
سنور کے ہر خزاں نصیب شاخِ گُلبدن بنی

دُھواں نئی سحر کی شوخ روشنی میں گھُل گیا
فَضا میں آج پرچمِ نشاط و رنگ کھُل گیا
جزیرہ ہائے دیو، دمن، گوا کا داغ دُھل گیا

جبینِ ارضِ کائنات پر ہیں داغ اور ابھی
سِسک رہے ہیں تیرگی میں کچھ چراغ اور ابھی

غزل

ملنے کا فائدہ؟ جو بلا مانگنے کے بعد
شرمندہ ہیں خدا سے دُعا مانگنے کے بعد

رکھ بھی سکیں گے اجرِ محبت سنبھال کے؟
دامن کو دیکھتے ہیں صِلا مانگنے کے بعد

کچھ اور سُرخی کفِ قاتل نکھر گئی
میرے لہو سے رنگِ حنا مانگنے کے بعد

ہم چُپ رہے تو سر پہ قیامت گذر گئی
دیکھیں تو خوں بہائے وفا مانگنے کے بعد

دیکھا چمن کا حال پریشاں تو لوٹ آئے
پھُولوں کی زندگی کی دُعا مانگنے کے بعد

رقصِ جنُوں کو چاہیئے کونین اے خدا
تھک کر کھڑے ہیں جرأتِ پا مانگنے کے بعد

غزل

جب شبنم سے ہاتھ جلالوں، پھولوں سے گھائل ہو جاؤں
دو رستوں میں اک رستہ ہے، روؤں یا پاگل ہو جاؤں

وقت کی بوجھل پلکوں سے میں ٹپکا ہوں اک آنسو بن کر
پھیلوں تو بن جاؤں زمانہ، سمٹوں تو اِک پَل ہو جاؤں

یا میری کرنوں کا جادو، راتوں کی تقدیر بدل دے
یا میں تارا بن کر ٹوٹوں، تاریکی میں حل ہو جاؤں

اس خار و خس کی دنیا میں، لایا ہوں قسمت شعلے کی
بھڑکوں، چمکوں، رقص کروں اور نظروں سے اوجھل ہو جاؤں

نیا خُون

خاک پر گر کے لہو کون و مکاں تک پُہنچا
روشنی بن کے مہ و کاہکشاں تک پُہنچا
عرشِ اعظم کے پرے، لوح و قلم سے آگے
کربلا سے یہ لہو جانے کہاں تک پُہنچا
یہ لہو بن کے جلا راہِ وفا میں قندیل
کارواں مرحلۂ عزمِ جواں تک پُہنچا
تازگی بن کے رگِ لالہ و گُل میں دوڑا
ابر بن بن کے بیابانِ تپاں تک پُہنچا

یہ لہو چھیڑ گیا سلسلۂ دار و رسن !
یہ لہو آگ کی صورت رگِ جاں تک پہنچا
جل گئی شمع، اندھیروں کا جگر چاک ہوا
یہ لہو وقت کی لہروں پہ جہاں تک پہنچا
انقلابات کی تاریخ کا عنواں بن کر
یہ لہو قتل گہِ عصرِ رواں تک پہنچا

چارہ گر آئے بہت کوئی مسیحا نہ ہوا
سینۂ ارض کے زخموں کا مداوا نہ ہوا
کربلا آج بھی برپا ہے بہ اندازِ دگر
دشت میں رقصِ شہیداں کا تماشہ نہ ہوا
بند ہے آج بھی کتنوں کے لئے نہرِ فرات
معرکہ کوئی بظاہر لبِ دریا نہ ہوا
زینبیں اپنے گھروں میں ہیں ردا سے محروم
دشت و کہسار میں خیمہ کہیں برپا نہ ہوا

رات بیتی ہی رہی چاند ستاروں کا لہو

وقت کی تیرہ فضا دل میں اُجالا نہ ہوا

کون سا وقت ہے پھر رُوح کی بیداری کا

زخمِ احساس اگر آج بھی تازا نہ ہُوا

دِل کو بیدار کریں، رُوح کو بے باک کریں

عصرِ حاضر کے یزیدوں کی قبا چاک کریں

اشک بے سُود ہے کِشتِ تمنّا کے لئے

خُونِ دِل، خُونِ جگر سے اِسے نمناک کریں

موجِ خُوں غازۂ رُخسارِ اُمم ہوتی ہے

آؤ اَب وقت کی آواز کا اِدراک کریں

زیرِ محراب نہیں ہوتی مُحبّت کی نماز

سایۂ دار میں اِک سجدۂ بیباک کریں

زندگی اپنے شہیدوں کا اَدب کرتی ہے

یہ زمیں آج نیا خُون طلب کرتی ہے

غزل

جب سے تم نے ہاتھ چھُڑایا، ہم بورائے پھرتے ہیں
بستی بستی، چوکھٹ چوکھٹ دھائے دھائے پھرتے ہیں

ماہ جبینوں، زہرہ وشوں سے مِلنا جُلنا چھوٹ گیا
روشنیاں تو ڈوب گئیں، آنکھوں میں سائے پھرتے ہیں

شبنم کی اِک بُوند نہ برسی اپنے گھر کے آنگن میں
پھر کس ویرانے کی دُھن میں یا دل چھائے پھرتے ہیں

شہر میں اک ہنگامہ سا ہے مِلنا جُلنا بند کرو
لوگ ہمیں رُسوا کرنے کو قسمیں کھائے پھرتے ہیں

دیواروں سے سر ٹکرا کر مرجانے کی ریت گئی
آج بھی ہیں دیوانے لیکن سائے سائے پھرتے ہیں

قیصرؔ دنیا کِس کِس کا مُنہ دیکھے گی اور روئے گی
ارمانوں کے کتنے لاشے ہم کفنائے پھرتے ہیں

غزل

زخموں کو مرہم کہتا ہوں، قاتل کو مسیحا کہتا ہوں
جو دل پر گذرا کرتی ہے، میں پردا پردا کہتا ہوں

زُلفوں کو گھٹائیں کہتا ہوں، رُخسار کو شعلہ کہتا ہوں
تُم جتنے اچھّے لگتے ہو، میں اس سے اچھّا کہتا ہوں

اَب رِیت یہی ہے دُنیا کی، تُم بھی نہ بنو بیگانہ کہیں
الزام نہیں دَھرتا تُم پر، اِک جی کا دھڑکا کہتا ہوں

اے سوزِ دفا! جل بُجھنے میں کیا لذّت حاصل ہوتی ہر
جس شمع نے دامن پھُونک دیا اُس شمع کو اپنا کہتا ہوں

اے پیرِ مُغاں! خُود کو تشنہ کہتے ہُوئے غیرت آتی ہے
جو گھونٹ پیئے ہیں زہر بھرے اُنکو بھی صہبا کہتا ہوں

ہر چاک میں سو سو تہمت ہے، ہر تار میں سو سو رسوائی
اِس موڑ پہ ہے آشفتہ سری، دامن کو دھیا کہتا ہوں

اربابِ چمن، جو کہتے ہیں، وہ نام مجھے معلوم نہیں
جس شاخ پہ کوئی پھول نہ ہو میں اسکو تمنّا کہتا ہوں

قیصرؔ وہ نوا، لاحاصل ہے، جو حرف لبوں پر لہرائے
چھو لے جو دِلوں کی گہرائی میں اسکو نغمہ کہتا ہوں

بِرہن

نہ تن بدن کی خبر ہے نہ ہوش آنچل کا
پگھل کے رنگ بہا عارضوں پہ کاجل کا

لٹیں بکھر کے پریشان ہیں عذاروں پر
خزاں کی رات کا سایہ پڑا بہاروں پر

جھکی جھکی سی یہ نظریں یہ نیم وا آنکھیں
تصوّرات کی پرچھائیوں سے بوجھل ہیں

بناؤ پر ہے طبیعت نہ دل سنگھار میں ہے
غُبار آئینے میں، آئینہ غُبار میں ہے

وہ بات حُسن کی جلوہ نمائیوں میں نہیں
کہ چوڑیاں بھی تمہاری کلائیوں میں نہیں

زباں خموش ہے لیکن نگاہ بولتی ہے
یہی ادا تو محبت کا راز کھولتی ہے

خلا میں گھُور رہی ہو، اُداس بیٹھی ہو
نہ جانے کب سے دریچے کے پاس بیٹھی ہو

اُٹھو ـــــ چراغ جلاؤ کہ شام ہوتی ہے!

غزل

روز نئے سانچے میں ڈھلتی رہتی ہے
دُنیا کیا کیا رنگ بدلتی رہتی ہے

چُپکے چُپکے شمع پگھلتی رہتی ہے
دِھیرے دِھیرے رات بھی ڈھلتی رہتی ہے

پھُولوں کو ہم عارض بھی کہہ سکتے ہیں
خُوشبو اپنا نام بدلتی رہتی ہے

مایُوسی کی لہریں کتنی ٹھنڈی ہیں!
دِل میں جیسے بَرف پگھلتی رہتی ہے

اپنی محفل آپ بچائے رکھے گا
دیوانوں کی راہ بدلتی رہتی ہے

سُورج پر چھا جائیں بادل کتنے بھی
ہلکی ہلکی دُھوپ نکلتی رہتی ہے

ہم بھی اِک اُمّید لگائے پھرتے ہیں
سُنتے ہیں تقدیر بدلتی رہتی ہے

قیصرؔ ساری رات سُلگتا رہتا ہُوں
دِل سے ٹھنڈی آنچ نکلتی رہتی ہے

غزل

بیدردوں کے آگے شاعر کیا روئے کیا گائے
اپنے دل کے چھالے پھوڑے، اپنا جی بہلائے

رستے رستے لاکر ہم نے گھر کے دِیپ جلائے
دل سوزی کا یہ پھل پایا، دیوانے کہلائے

اپنی اپنی سوچ میں سب ہیں گُم سُم اور اُداس
ساتھ ہیں لیکن سب تنہا ہیں کون کسے گھرائے

غم کی راہ میں اکثر آئے، مَر جانے کے موڑ
جانے کِس اُمید پہ دِل نے سارے زخم گنوائے

اپنی اپنی زنجیروں میں اُلجھے ہیں احباب
کون ہمارے دروازے پر دستک دینے آئے

جنگل جنگل خاک اُڑا کر بیٹھے ہیں ہم لوگ
یارو ہم کو بھول نہ جانا جب دھرتی مُسکائے

اِک دن آ کر دیکھ تو جاؤ دیوانوں کا حال
روتے ہیں اور سوچ رہے ہیں دامن بھیگ نہ جائے

کس بادل کی آہٹ سُن لی کس رُت کی آواز
سُوکھی شاخیں جھوم رہی ہیں سو سو آس لگائے

قیصر اپنا جیون ٹھہرا چوراہے کا دیپ
ہم دُنیا کو راس آئیں گے، دُنیا راس نہ آئے

وقت کی دُھول

آج تُو دفعتاً سامنے آگئی
تیری رفتار بادِ صبا کی طرح
پندرہ سال کا درد مہکا گئی

میں سرِ راہ حیران سا رہ گیا
یادِ ماضی کی شبنم برسنے لگی
اور میں دیر تک بھیگتا رہ گیا

چاندنی میں نہایا بدن تھا وہی
چھن رہی تھی وہی دُودھیا روشنی
آئینہ آئینہ پیرہن تھا وہی

تیرے تیور، ترے ناز ویسے ہی تھے
اب کسی اور کے واسطے ہی سہی
مُسکرانے کے انداز ویسے ہی تھے

زندگی تیری خوش حال پہلے بھی تھی
وقت کی دُھول تو صرف مجھ پر جمی
تو اسی طرح کچھ سال پہلے بھی تھی

بلکہ کچھ اور بھی دل نشیں ہوگئی
رنگ کھلتا گیا، رُخ نکھرتا گیا
میرے شعروں سے بڑھ کر حسیں ہوگئی

دردِ بیچارگی جان پائی نہ تُو
میرا احساس اِک زخم سے بچ گیا
شکر ہے مجھ کو پہچان پائی نہ تُو

غزل

اُمّیدوں کے بیج کہاں تک بوئیں ہم
کوئی اَکھوا پھُوٹے تو خوش ہوئیں ہم

ماضی جاتے جاتے سو دُکھ چھوڑ گیا
کیا کیا بوجھ سروں پر اپنے ڈھوئیں ہم

کالی رات بڑی زہریلی ناگن ہے
پہلے اس کا پھن کاٹیں پھر سوئیں ہم

محرومی کے آنسو پانی ہوتے ہیں
کوئی تمنّا بر آئے تو روئیں ہم

اِک مُدّت سے ترسے ہیں، اے پیرِ مُغاں!
شبنم سے کیا سُوکھے ہونٹ بھگوئیں ہم

پاگل موجیں ہم کو تنکا سمجھی ہیں
طُوفانوں کو اپنے ساتھ ڈبوئیں ہم

غزل

پلکوں پہ سو چراغ جلائے کھڑے رہے
ہم تند آندھیوں کے مقابل اڑے رہے

جاں دادگانِ شوق کے جھنڈے گڑے رہے
دھبے لہو کے، دار پہ برسوں پڑے رہے

سارے چراغ لے کے زمانہ چلا گیا
ہم اپنی روشنی میں اکیلے کھڑے رہے

اے شامِ درد! ہم بھی کوئی چاندنی تھے کیا
نہلا کے آسمان، گلی میں پڑے رہے

محفل میں پتھروں کی نمائش کا دور تھا
ہم اپنے آئینوں کو چھپائے کھڑے رہے

اُلٹی کہانی

اچھّی امّی !

چاند نگر کے لال گگن کی سیما پر

یہ گول سا دھبّا کیسا ہے ؟

یہ جنگل ہے یا بستی ہے ؟

جِس سے رات گئے پہر دل تک

کالی دُھول برستی ہے !

آج کہانی رہنے دو کچھ اس دھبّے کی بات کرد

تُم نے دیکھا مگر اسکو سمجھا نہیں
میرے بچّو! یہ دُنیا ہے دھبّا نہیں
آج ویران ہے کل چمن یہ بھی تھی
اپنے اَجداد کی انجمن یہ بھی تھی
نوعروسِ بہاراں کی محفل تھی یہ
آدمی کا دھڑکتا ہوا دل تھی یہ
لالہ و نسترن کا یہ کاشانہ تھی
رنگ و بُو کا حسیں آئینہ خانہ تھی
اِس کے دریا اُبلتے چھلکتے ہوئے
اس کے بادل برستے مہکتے ہوئے
اِس کی صُبحیں حسین و دلآویز تھیں
اِسکے دن، اِسکی راتیں نشہ خیز تھیں
علم و تہذیب کا میکدہ تھی کبھی
یہ بڑی خوبصورت جگہ تھی کبھی
اس کی بادِ سحر نرم و آہستہ رَو
اسکی شبنم میں سو کہکشاؤں کی ضَو

اس کے پربت سی چاندی اُبلتی ہُوئی
بَرف جمتی، چمکتی، پِگھلتی ہُوئی

دشت میں آہوؤں کی قطاریں کہیں
آسمانوں پہ بگلوں کی ڈاریں کہیں

وادیاں ایک گہوارۂ رنگ و بُو
ہر شجر سبز گوں، ہر کلی خُوب رُو

ہر گلستاں سَمن پوش و عَنبر فشاں
ہر بیاباں میں اُڑتے ہوئے کارواں

دُور و نزدیک کھیتوں کی ہریالیاں
جھُومتی، سرسراتی ہوئی بالیاں

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا رقص کرتی ہوئی
پتّی پتّی نکھرتی، سَنورتی ہوئی

سادہ سادہ کساں ہل چلاتے ہوئے
گیت گاتے ہوئے مُسکراتے ہوئے

گاؤں کی ہر گلی اِک بہشتِ بریں
خاک کا ذرّہ ذرّہ بہار آفریں

شہر کی زندگی ــــــ بزم گاہِ ہنر
آئینہ آئینہ بام و دیوار و در
علم و فن کے چمن لہلہاتے ہوئے
راستے روشنی میں نہاتے ہوئے
جہد کے قافلے تیز اُڑتے ہوئے
فاصلے ہر قدم پر سکڑتے ہوئے
ہر چمن مرکزِ نکہت و نُور تھا
ہر مقامِ نظر، جلوۂ طُور تھا
شرق سے غرب تک آدمی کا جلال
زیرِ پائے بشر تھے جنوب و شمال
سنگ و فولاد کی قوّتوں کا فسوں
اہلِ تدبیر کے سامنے سرنگوں
برق و باراں کے دُوت آدمی کے مشیر
ایٹمی قوّتیں اس کے فن کی اسیر
آسماں زیر تھا اسکی پرواز سے
تیز تھی اُس کی رفتار آواز سے

ہفت قُلزم کی ڈور اسکے ہاتھ میں تھی
ساری دُنیا کی چھُور اسکے ہاتھ میں تھی

دفعتاً وقت اس موڑ پر آ گیا
آدمی کو غرورِ ہُنر کھا گیا

ایک دھرتی تھی دو نیم کر دی گئی
دو بلاکوں میں تقسیم کر دی گئی

مُلک گیری دل و روح میں بس گئی
تیرگی عقل کے نُور کو ڈس گئی

آدمی گردِ طبقات میں کھو گئے
اپنے اپنے خیالات میں کھو گئے

الغرض ایک دن جنگ ہو کر رہی
آدمی پر زمیں تنگ ہو کر رہی

ایٹمی بم پھٹے، ہیڈروجن اُڑے
سلسلے کوہ کے سَن سَناسن اُڑے

ماسکو اور نیو یارک جلنے لگے
شہر مٹنے لگے پارک جلنے لگے

نیل فرعون کے شہر میں آ گیا
قاہرہ جنگ کے قہر میں آ گیا

وا لگا کے کناروں پہ شعلے اُگے
چین کی سر زمیں پر پھپھولے اُگے

تاج کا دل پگھل کر لہو بن گیا
لالہ زاروں پہ کالا دھواں تن گیا

شرق سے غرب تک ایک عالم ہوا
ہر سمندر اُڑا، اور شبنم ہوا

زلزلہ ہر طرف تیرگی ہر جگہ
موت کے بس میں تھی زندگی ہر جگہ

نازنینانِ شعلہ بدن جل گئے
لالہ گوں لالہ گوں پیرہن جل گئے

عارضوں کے اُجالے پگھلنے لگے
جھومروں کے حسیں چاند جلنے لگے

چمپئی گھونگھٹوں میں دھواں بھر گیا

شبنمی انکھڑیوں کا نشہ مر گیا

الغرض جنگ کی آگ بڑھتی گئی

یہ لہو کی ندی اور چڑھتی گئی

اونچے اونچے پہاڑوں کے دل ہل گئے

آسمان و زمیں خاک میں مل گئے

علم و تہذیب کا یہ محل ڈھ گیا

جل گئی ساری دنیا، نشاں رہ گیا

پیارے بچّو!

چاند نگر کے اُجلے اُجلے ماتھے پر

ہر شام دکھائی دیتا ہے جو دھبّا کالا کالا سا

یہ جنگ کی ماری دنیا ہے

اک کھوسٹ بڑھیا پھرتی ہے اب غاروں اور گپھاؤں میں

جس کی جلتی سانسوں سے اُڑتا ہے دھواں مٹیالا سا

اور دھیرے دھیرے برستا ہے

غزل

پنہاں یہ حقیقت نہیں صاحب نظراں سے
رُسوا ہے جنوں کج رَوِیِ ہم سفراں سے

دامن میں لئے خارِ بیابانِ ملامت
کیوں بیٹھے ہیں چُپ پوچھئے ان دیدہ دراں سے

اِک آس پہ ٹوٹا ہوا دل لیکے گئے تھے
لَوٹ آئے یُونہی کارگہِ شیشہ گراں سے

کس زُعم میں خنجر کفِ نازک میں لیا تھا
پُوچھیں گے کبھی ماہ وشاں، سیم بَراں سے

اے فطرتِ بیباک! تقاضائے حیا ہے
آ لَوٹ چلیں انجمنِ بے خبراں سے

قیصرؔ خلشِ زخم پہ رو بھی نہیں سکتے
بَن آئی ہے جی پر کرمِ چارہ گراں سے

ہم اِنتظار میں ہیں

یہ سُرخ جنگ جو برپا ہوئی ہے سرحد پر
یہ تیز آگ جو پھیلی ہے کوہساروں میں
زیادہ روز نہ چھڑکے گی وادیوں میں لہُو
زیادہ دیر نہ ٹھہرے گی لالہ زاروں میں
شکست کھائیں گے بادِ شمال کے جھونکے
رگِ نمو ابھی زندہ ہے شاخساروں میں
بڑے غرور سے آئے ہیں دُشمنانِ وطن
انہیں بہادو انہی کے لہُو کے دھاروں میں

جہاں سے قافلۂ نو بہار گذرے گا

چراغ تم نے جلائے ہیں اُن دیاروں میں
دُعائیں دیں گے تمہارے بدن کے زخموں کو
کھلیں گے پھول جو اگلے برس بہاروں میں
فنا نصیب ہیں دُشمن کے حوصلوں کے محل
انہیں مِلا دو ہمالہ کے سنگ پاروں میں
ہماری رُوح کی آواز ہے یقین کرو
تمہارا نام بھی شامِل ہو جاں نثاروں میں
تمہارے ہاتھ میں سب سے بلند پرچم ہو
چلیں وطن کے سپاہی جہاں قطاروں میں
تمہارے ہونٹوں پہ نغمے ہوں کامرانی کے
تمہارے پاؤں کی مٹّی اُڑے ستاروں میں
ہماری فکر نہ کرنا کہ ہم اُداس نہیں
وطن کے نام پہ جی لیں گے خارزاروں میں

خزاں کے زخم سے دو دن لہو ٹپکتا ہے

پھر اُس کی یاد بھی آتی نہیں بہاروں میں

دمِ وداع جو پل بھر کو دل میں جاگا تھا

وہ دَرد ڈوب گیا آنسوؤں کی دھاروں میں

وہ اس حسین جدائی کا لطف کیا جانیں

ہمیں جو لوگ سمجھتے ہیں سوگواروں میں

ہم اپنے گھر میں اکیلے ہیں اور نہیں بھی ہیں

تمہاری یاد کی خوشبو ہے غم گساروں میں

تمہیں قسم جو محبّت کی آگ یاد آئے

ہمالیہ کے سمن پوش برف زاروں میں

تمہیں قسم جو ہمارا سُہاگ یاد آئے

محاذِ جنگ پہ، تلوار کے حصاروں میں

کب آرہے ہو لکھو فتح کا نشاں لے کر

ہم انتظار میں ہیں نذرِ جسم و جاں لے کر

غزل

دِل سے اُمڈے، آنکھ سے ٹوٹے دامن پر تھرّائے کیوں؟
جو غم آنسو بن جائے وہ میرا غم کہلائے کیوں؟

پہلے تمہیں نے سب میں ہم کو، دیوانہ مشہور کیا
اب جو ہمارے سر پر پتھّر برسے تو گھبرائے کیوں؟

اپنی قسمت دشت نوردی اپنا حاصل گردِ سفر
پاؤں کے چھالے گِننے والے ساتھ ہمارے آئے کیوں؟!

غم کی دھوپ میں چلتے رہنا تم تو آساں کہتے تھے
تھک کر ڈھونڈ رہے ہو تیسر دیواروں کے سائے کیوں؟

خُون کے پھُول

جہاں بھی خون ٹپکتا ہے سرفروشوں کا
بلند ہو کے وہ دھرتی گگن سے ملتی ہے
اُڑے جہاں سے شہیدوں کے جسم کی خوشبو
بہار آکے گلے اس چمن سے ملتی ہے
جو ساتھ لائے صلیب و کفن کی سوغاتیں
وہ موت ناز و ادا میں دُلھن سے ملتی ہے

وفا بغیرِ لہو سرخرو نہیں ہوتی
یہ راہ منزلِ دار و رسن سے ملتی ہے
نکھار دیتی ہے آئینۂ جبینِ وطن
شعاعِ رنگ جو زخمِ بدن سے ملتی ہے
وہ روشنی جو لبِ زخم سے ابھرتی ہے
اُفق پہ ناچتی ہنستی کرن سے ملتی ہے
وہ سُرخیِ سرِ دامن جو ہو وطن کیلئے
جمالِ لالہ و سرو و سمن سے ملتی ہے
وہ موت جس سے مہکتے ہیں زندگی کے چمن
بڑے خلوص بڑے بانکپن سے ملتی ہے

حیات پھول بکھیرے تمہاری راہوں میں
کہ تم نے عید منائی ہے رزم گاہوں میں[1]

[1] سرحدی محاذِ جنگ۔

غزل

یادیں، آنسو، سائے، شعلے، سنّاٹا، تنہائی، رات
جھلائے جھلائے تارے، سنولائی سنولائی رات

فن کی آگ بجھی جاتی ہے، سرد ہوئے جاتے ہیں شعر
جانے کب تک پگھلے گی یہ صدیوں کی پتھرائی رات

سوچوں کی زنجیر میں اُلجھے پڑتے ہیں راہی کے پاؤں
بوجھل جی، انجانی بستی، سونی راہ، پرائی رات

پو پھٹنے کی سُن گُن پاکر، سوچ رہی ہے اپنا حشر
ڈھلتے اندھیاروں سے لپٹی پڑتی ہے بورائی رات

جاتے جاتے چھوڑ گئی، پلکوں پلکوں پر درد کی اداس
ٹوٹ کے برسی دوارے دوارے انگنائی انگنائی رات

یہ بے خوابی، یہ بیتابی، یہ اُلجھن، یہ طُولِ فراق
ناپ رہی ہے جیسے اُن کی زُلفوں کی لمبائی رات

دھرتی کے کونے کونے میں، ڈھونڈھ رہی ہے اپنی قبر
صدیوں کے گہرے کُہرے کی چادر میں کفنائی رات

روشن روشن چہرہ اُن کا جیسے جگمگ جگمگ چاند
بِکھری بِکھری زُلفیں جیسے گھبرائی گھبرائی رات

روشنیوں کے بدلے برسی قیصرؔ دل پر یاد کی دھول
اپنے گھر کے چاند ستارے جانے کہاں بھول آئی رات

خاکِ پروانہ

چِتا کو جب ترا ٹھنڈا بدن سونپا گیا ہو گا
شرارے کِھل گئے ہوں گے، دھواں لہرا گیا ہو گا
قضا کو شرم کے مارے پسینہ آ گیا ہو گا
یہ منظر دیکھنے والوں سے کب دیکھا گیا ہو گا

محبّت کے پرستاروں، وفا کے سوگواروں نے
نِگاہیں پھیر لی ہوں گی ترے ماتم گُساروں نے

نظارے شہر و ساحل کے پریشاں ہو گئے ہوں گے
ڈھلی ہو گی جو شامِ غم، ستارے سو گئے ہوں گے
شعاعیں بُجھ گئی ہوں گی، اُجالے کھو گئے ہوں گے
تری ٹھنڈی چِتا پر شب کے سائے رو گئے ہوں گے

اُگا ہو گا جو پُورا چاند، دھبّا بن گیا ہو گا
سیہ آنچل سا جمنا کے کنارے تن گیا ہو گا

تماشے زندگی بھر تُو نے سوزِ دل کے دیکھے تھے
غُبارِ رہگذر میں راستے منزل کے دیکھے تھے
نظارے، حلقۂ گرداب سے ساحل کے دیکھے تھے
تری آنکھوں نے جتنے خواب مُستقبل کے دیکھے تھے

نئی پَود آج ان خوابوں کی ذمّہ دار ہوتی ہے
نہ گھبرا مرنے والے! زندگی بیدار ہوتی ہے

تری فکروں کے دھارے بہہ چلے گنگ و جمن بن کے
ترے آدرش نے دھرتی کو ڈھانکا ہے گگن بن کے
ترے دل کے لہو سے کھل گئی مٹی چمن بن کے
وطن کا گوشہ گوشہ مسکرا اٹھا دلھن بن کے

تری صورت کسی کو جاوداں ہوتے نہیں دیکھا
کسی قطرے کو اتنا بیکراں ہوتے نہیں دیکھا

تری گفتار میں بادِ صبا کی گل فشانی تھی
ترے افکار میں دریا کے پانی کی روانی تھی
تری تہذیب اک عہدِ محبت کی نشانی تھی
تری ذات ایک دورِ جہد کی زندہ کہانی تھی

بہت مشکل ہے کوئی یوں وطن کی جان ہو جائے
تجھے پھیلا دیا جائے تو ہندوستان ہو جائے

زمیں ماتم کدہ ہے، آسماں تیرا عزا خانہ
ترے پھولوں سے مہکے دشت و دریا شہر و ویرانہ
ہوائیں تیری خوشبو، پانیوں میں تیرا افسانہ
فنا ہو کر فنا ہوتی نہیں ہے خاکِ پروانہ

کرن بن کر حریمِ وقت کی چلمن سے چھنتی ہے
یہی مٹّی سمٹ کر پھر نیا پروانہ بنتی ہے

تیشہ کے بعد

ظفر گورکھپوری

کا

دوسرا شعری مجموعہ

« وادی سنگ »

(زیر ترتیب)